تعلیم میں بیرونی مداخلت اور اصلاحِ کار

ڈاکٹر محمد اظہار الحق ○

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے، تو اس نے اہلِ ہند کے خلاف برطانیہ میں، یہ بے بنیاد پروپیگنڈا کیا کہ اہلِ ہند اَن پڑھ، بے تہذیب اور وحشی ہیں، لہٰذا انھیں تعلیم دینے اور مہذب بنانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ تاجِ برطانیہ نے اہلِ ہند کی تعلیم کے لیے ۱۸۱۳ء میں، کمپنی کے چارٹر میں، ایک لاکھ امداد کی مد شامل کی، اور پس پردہ تعلیمی نظام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا منصوبہ بنایا۔

ابتدائی دور میں تعلیم حسبِ سابق، فارسی و عربی میں دی جاتی تھی۔ مگر ۱۸۳۵ء میں یہاں رہنے والوں کو اپنے علمی ورثے سے محروم کرنے اور ماضی کی تاریخ سے اس کا رشتہ منقطع کرنے کے لیے، انگریزی زبان میں تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا، اور ملازمت کا حصول انگریزی زبان کے ساتھ مشروط کر دیا گیا۔ یہی وہ آرزو اور خواہش تھی جو چارلس گرانٹ نے برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کی تھی کہ پارلیمنٹ، حکومت اہلِ ہند کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرے، انھیں مغربی علوم، سائنس وٹکنالوجی کے علاوہ عیسائیت کی تعلیم دے، اور ذریعۂ تعلیم انگریزی کو بناتے ہوئے انگریزی زبان و ادب کو نصاب میں شامل کرے۔ اس وقت علما انگریزی سیکھنے کے مخالف نہ تھے، اور بہت سے نامی گرامی علما نے انگریزی اور پرتگالی زبانیں سیکھی تھیں۔[1] خود شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے انگریزی سیکھنے کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔[2]

مسلمان جس چیز کے خلاف تھے، وہ عیسائی مدارس کے اندر مسیحیت کی تعلیم، ان کی تہذیب، لباس واطوار اور بائیبل کی لازمی تدریس تھی، جب کہ پروپیگنڈا یہ کیا گیا کہ مسلمان تعلیم کے خلاف ہیں۔ ۱۸۴۰ء میں ایک اور حکم نافذ کیا گیا، جو مسلمانوں کے لیے ایک نئی اور عجیب چیز تھی، کہ پڑھانے

○ ڈیرہ اسماعیل خان

کے عوض ہر طالب علم سے فیس وصول کی جائے۔[۳] یعنی تعلیم کو پہلی دفعہ کمائی کا ذریعہ بنایا گیا۔

یہ وہ دور تھا کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ اہلِ ہند عموماً، اور مسلمان بالخصوص اِن کا شکار تھے۔ ایسی حالت میں، جب کہ لوگ پیٹ بھرنے کی فکر میں تھے، ان پر تعلیم کی مد میں مزید فیس عائد کرنے کا مطلب، انھیں تعلیم سے محروم کرنا تھا۔ اس حکم نامے سے ہندوؤں سے زیادہ، مسلمان متاثر ہوئے، اور یہ چیز انھیں تعلیم کے میدان میں پیچھے دھکیلنے کا سبب بنی۔ اس حقیقت کا اعتراف اس وقت کے سیکریٹری وزارتِ داخلہ ہیلی (۱۸۶۰ء) نے بھی کیا ہے: ''کیا یہ حیرت کا مقام ہے کہ مسلمان ایک ایسے نظام سے کنارہ کش رہے، جو پورے طور پر ان کے مفاد کے منافی تھا، اور ان کی تمام مجلسی روایات کے خلاف تھا۔ تعلیم یافتہ مسلمان دیکھ رہا ہے کہ اسے اختیارات کے حصّے اور حکومتی مراعات سے محروم رکھا گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی کے تمام فوائد ہندوؤں کے حوالے کر دیئے گئے ہیں''۔[۴]

مسلمان علما نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں پیچھے دھکیلا جا رہا ہے، اور ہندوؤں کو ترجیح دی جا رہی ہے، تو انھوں نے خود جدید مدارس قائم کرنے کی طرف توجہ دی۔ مگر انھیں اپنی مرضی سے جدید مدارس قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مفتی ولایت اللہ نے اپنے خرچ پر فتح گڑھ میں سکول کی ایک خوب صورت عمارت بنوائی، اور اس کے لیے کچھ سرمایہ وقف کیا۔ پھر کلکتہ کی مجلسِ تعلیمات سے اس کی منظوری لینے کے لیے درخواست دے دی، جو ٹال مٹول کے بعد بالآخر سرد خانے کی نذر ہوئی۔[۵]

مسلمانوں کے 'وقف' سے چلنے والے بہت سارے تعلیمی اداروں کی پہلے گرانٹ بند کر دی گئی، پھر اگلے مرحلے میں انھیں اپنے کنٹرول میں لے لیا گیا۔ اس پر مزید ظلم یہ کیا گیا کہ اس وقف املاک کی رقم سے انگریزی کالج بنائے گئے، اور پھر زیادتی یہ بھی کی گئی کہ ان کالجوں میں ہندو طلبہ کو داخلے دیے گئے، اور کسی مسلمان کو ان میں داخل نہ ہونے دیا گیا۔ اسی فتح پور کے کالج میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ پر جب مسلمانوں نے بھرپور احتجاج کیا، تو صرف ۳۰ طلبہ کو داخلہ دیا گیا، جب کہ اس کالج میں ہندو طلبہ کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔[۶]

یہ تمام حربے اہلِ ہند کو، بالخصوص مسلمانوں کو تعلیم سے دُور رکھنے کے لیے استعمال کیے

جارہے تھے۔اس کی وجہ کمپنی کے ڈائریکٹر جیکسن نے واشگاف الفاظ میں برطانوی پارلیمنٹ میں بیان کی تھی: ''ہم نے امریکا میں اسکول اور کالج کھولے، امریکا کو کھو دیا۔ اب ہم ہندوستان میں اس غلطی کا اعادہ نہیں کریں گے''۔[۷]

اس دور میں اردو، ہندوستان کی قومی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور ملک کے طول وعرض میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔مگر جب پرتگیزی گورے آئے تو انھوں نے پرتگالی میں تعلیم دینی شروع کی، اور جب انگریز گوروں نے قبضہ جمایا تو انھوں نے انگریزی کو بطورِ ذریعۂ تعلیم لازمی قرار دیتے ہوئے اسے نافذ کیا۔مگر ساتھ ساتھ سامراج نے اپنی انتظامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے علاقائی زبانوں کو بھی تعلیم میں شامل کیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصے بعد، ملک میں، ایک ہندوستانی کے بجائے مرہٹی، بنگالی، سندھی اور کونکنی وغیرہ قومیتیں ابھرنے لگیں۔ اردو جو کہ قومی زبان تھی، اس کے مقابلے میں دیوناگری زبان کو زندہ کرنے اور رائج کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں۔[۸]

تعلیم کے میدان میں ایک اور بڑا انقلابی قدم یہ اٹھایا گیا، کہ تعلیم کی ذمہ داری عیسائی مذہبی پیشواؤں کے سپرد کی گئی۔عیسائی مشنریوں نے ملک کے طول وعرض میں تعلیمی ادارے کھولے، جہاں عیسائیت کی لازمی تعلیم دی جاتی تھی۔ساتھ ہی، انھوں نے دیگر مذاہب، بالخصوص اسلام پر کھل کر اعتراضات کرنے شروع کیے، مناظرہ بازی کو ترویج دی گئی، اور نصابات کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا گیا۔حالانکہ ہندو اور مسلمان صدیوں سے یہاں اکٹھے رہ رہے تھے اور عمومی طور پر ان کے درمیان اس طرح کے مذہبی جھگڑے پیدا نہ ہوئے تھے۔ ہندستانی امور کے وزیر، جارج سیل فرانسس ہملین، نے ۲۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو لکھا تھا: ''ہمیں نصابی کتب اس طرح تیار کرنی چاہئیں کہ مختلف [نسلی ولسانی و مذہبی] فرقوں کے درمیان اختلافات کو تقویت حاصل ہو''۔[۹] اس سے کوئی ڈیڑھ ماہ قبل، کراس نامی ایک اور انگریز نے گورنر جنرل ڈفرن کو لکھا: ''مذہبی اختلافات ہمارے لیے فائدہ مند ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہندستانی تعلیم وتدریس سے متعلق کمیٹی، اس بات کا خیال رکھے گی''۔[۱۰]

ہندستان کی نئی نسل کو جسمانی طور سے کمزور، مزاج کے لحاظ سے کند اور عقل کے لحاظ مفلوج کرنے کے لیے، پورے منصوبے کے تحت جنوبی امریکا سے لال مرچ، تمباکو اور افیون کو لاکر

یہاں کاشت کیا گیا۔ لارڈ میکالے نے اپنے ایک بیان میں اسے کھل کر یوں بیان کیا: ''ہم افیون کے کاشت کی منظوری پوری قوم کو افیون کا عادی بنانے کے لیے نہیں دیں گے، بلکہ اس مذموم مقصد کے لیے دیں گے کہ وہ ہمارے غلبے کو قبول کریں''۔[11] ڈپٹی نذیر احمد کے بقول: ''ہندوستان میں بچوں کو افیون دینے کا ایسا رواج ہے کہ شاید ہی کوئی مسلمان بچہ اس سے محفوظ ہو''۔[12]

یہی وہ نشہ اور تعلیمی نظام ہے، جس کے بارے میں میکالے کے بہنوئی چارلس ٹریویلین نے ۱۸۳۸ء میں اپنی کتاب میں لکھا تھا: ''غلام ہندوستان کے پاس آزادی حاصل کرنے کے دو راستے ہیں: ایک انقلاب کا اور دوسرا اصلاح کا۔ انقلاب کی صورت میں ایک مہینہ میں 'مرہٹہ' یا 'اسلامی حکومت' قائم کی جاسکتی ہے۔ لیکن اصلاح کے ذریعے ہندوستان کو آزادی کے لیے ایک صدی درکار ہوگی''۔[13] ان کا یہ تجزیہ وقت نے درست ثابت کیا، کہ اہلِ ہند نے آزادی کے لیے انقلاب کے بجائے اصلاح کا راستہ اختیار کیا تو ۱۸۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک انھیں ایک صدی سے زیادہ عرصہ لگا۔

نئی سامراجی حکمت عملی اور اثرات

دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں یورپ و امریکا طاقت کے ذریعے ملکوں پر قبضہ کرنے سے بہت بدنام ہوئے، تو اس سامراج نے ان ملکوں کو غلام بنائے رکھنے کے لیے بالواسطہ طریقہ اختیار کیا۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں (MNCs) نے اقوام متحدہ (یو این او) بنائی۔ اقوامِ متحدہ کی چھتری کے نیچے ورلڈ بنک، ایشین بنک اور 'انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ' (آئی ایم ایف) جیسے ادارے بنائے گئے۔ اور پھر ان ممالک میں این جی اوز بنا کر، امداد کے نام پر، اپنی شرائط کے تحت، سودی قرضے دے کر، ملکوں کے نظام کو اپنے کنٹرول میں لیا۔

این جی اوز کو ۱۹۸۰ء کے عشرے سے کھل کر کھیلنے کا موقع ملا اور اکیسویں صدی کے آغاز میں پاکستان پر ڈکٹیٹر جنرل پرویز مشرف نے بین الاقوامی دباؤ کے تابع آکر تعلیمی پالیسی کے خدوخال وضع کیے۔ یہ پالیسی ۲۰۰۶ء میں تیار کر کے تعلیمی میدان میں تبدیلی لانے کے لیے نافذ کی گئی۔ یہ تعلیمی پالیسی بھی وزارتِ تعلیم کے نصابات ونگ میں تیار نہیں ہوئی، بلکہ یہ اسلام آباد میں 'پیس' نامی امریکی این جی او کے ادارہ میں بیٹھ کر بنائی گئی۔[14] درحقیقت اس تعلیمی پالیسی کے نتیجے میں ہی این جی اوز کی سرگرمیوں میں بڑی وسعت آئی۔

● **پرائمری تعلیم:** نظامِ تعلیم میں پرائمری سکول کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہاں سے بچے کی شخصیت پروان چڑھتی ہے، یہیں سے وہ اخلاق و کردار سیکھتا ہے، اور یہیں سے اس کی تعلیمی بنیادیں پڑتی ہیں۔ عام اصول کے مطابق یہاں چھ اساتذہ ہونے چاہئیں، کہ ایک استاد ایک کلاس کو روزانہ تین چار مضامین پڑھائے۔ ان کی تربیت اور اصلاح بھی کرے۔ لیکن اس وقت این جی اوز نے جو نظام دیا ہے، اس میں عموماً سکول میں دو اساتذہ ہوتے ہیں۔ پھر دورانِ سال ان دو اساتذہ کی ذمہ داری لگائی جاتی ہے کہ وہ محلے محلے گھومیں اور گھر گھر دروازے کھٹکھٹائیں اور بچوں کو سکول میں داخل کرائیں، ان کی رکھوالی بھی کریں، اور انھیں پڑھائیں بھی۔ پھر اسی بیچارے استاد کو، اس سے اس کی بنیادی ڈیوٹی چھڑوا کر سماجی ڈیوٹیوں پر بھی بھیج دیا جاتا ہے، ساتھ ہی اس پر سو فی صد نتائج دینے کی ذمہ داری بھی لگا دی جاتی ہے۔

● **مفت کتب:** مفت کتابیں دینا ایک اچھا اقدام ہے، اور ایک فلاحی ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ لیکن جب سے این جی اوز نے یہ کام ٹیکسٹ بک بورڈ سے لیا ہے، تب سے بچوں تک کتابیں بروقت نہیں پہنچ رہیں۔ پرائیویٹ اداروں تک سب سے پہلے پہنچی ہوتی ہیں۔ بعد میں گورنمنٹ اسکولوں تک پہنچتی ہیں۔ اور اس سلسلے میں بعض اوقات ہفتے اور مہینے لگ جاتے ہیں۔ جب بچے کو مہینہ بعد کتابیں ملیں گی تو وہ کورس کو کیسے مکمل کر سکے گا، اور کیسے سمجھ سکے گا؟

● **سیکنڈری انٹر امتحانات:** امتحانات بچوں کی قابلیت و اہلیت پرکھنے کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ امتحان کے ذریعے ہی بچے کے کمزور پہلو سامنے آتے ہیں، اور اس کی اصلاح ممکن ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت ملک کے اکثر تعلیمی بورڈوں میں چُن چُن کر بدعنوان افراد کو ذمہ داریوں پر بٹھا دیا گیا ہے، جہاں انٹر اور سیکنڈری سطح پر ایک طرف امتحانی ہال بااثر پرائیویٹ اداروں کو لاکھوں کے عوض بیچ دیئے جاتے ہیں۔ پھر پہلی، دوسری، تیسری پوزیشنوں کی بولی لگتی ہے، پھر ہر پوزیشن پر ۱۰، ۱۰ طلبہ کو لایا جاتا ہے، اور اس کے اپنے ریٹس ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فیل پرچوں کے پاس کرنے کے اپنے ریٹس ہیں، اور ڈویژن بہتر بنانے کی الگ قیمت۔

ہم یہاں ڈیرہ اسماعیل خان کی مثال دیتے ہیں، جہاں کرپشن کی ثابت شدہ انکوائریوں میں ایک فرد کو، جسے یونی ورسٹی سینڈیکیٹ نے اس کے انتظامی عہدے کے لیے نااہل قرار دیا تھا،

اسے بورڈ میں کنٹرولر لگا دیا گیا۔ شکایات پر اسے وہاں سے ہٹا دیا گیا، مگر ساتھ ہی اسے ایک یونی ورسٹی میں وائس چانسلر بنا دیا گیا۔ یونی ورسٹی کے ایک ایڈیشنل کنٹرولر کو، جس پر کئی افراد کو جعلی ڈگریاں دینے کا الزام عدالت سے ثابت ہو چکا تھا، اسے وہاں سے اٹھا کر یونی ورسٹی کا کُل وقتی کنٹرولر بنا دیا گیا۔ ملک بھر میں وائس چانسلرز کو میرٹ کے بجائے چیف منسٹرز کی خواہش پر لگایا جاتا ہے، اور اس کا نتیجہ آئے روز مختلف سکینڈلز کی صورت میں، اخبارات کی زینت بنتا رہتا ہے۔ یوں تعلیم کو سیاستدانوں اور کرپٹ مافیا کا کھلونا بنا دیا گیا ہے۔

● **نج کاری کی پالیسی:** ملکی دیگر اداروں کی طرح تعلیمی نجکاری کے فیصلے نے تعلیم کے نام پر اداروں کو مال کمانے کی منڈیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور آج میڈیکل، انجینئرنگ، تعلیم، قانون، ایم فل اور پی ایچ ڈی، جو بھی ڈگری کوئی خریدنا چاہے، اسے مل سکتی ہے، کیونکہ ڈگری تو ڈگری ہوتی ہے۔

● **قومی تشخص پر اثر:** این جی اوز کی تعلیم میں مداخلت کا اثر تعلیمی اداروں اور افراد پر یہ پڑا کہ ان کے ادارے کھلم کھلا ملک کی نظریاتی بنیاد پر حملے کرنے لگے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال لاہور کا ایک اعلیٰ نجی تعلیمی ادارہ ہے۔ جہاں نہ صرف صنفی برابری کے نام پر صنفی تعصب کو ہوا دی جارہی ہے، بلکہ سیمیناروں اور مذاکروں میں تقسیمِ ہند کو غلط کہا گیا۔ اس میں مسلم شناخت سے نفرت اور ایشیائی شناخت پر زور دیا گیا، اخلاقی اقدار اور نظریاتی پہچان کو بُرا کہا گیا۔ یہاں تک کہ ایک شریکِ نظم خاتون نے تو ملک کا نظریاتی نظام لپیٹنے اور ملک توڑنے کی بات ان الفاظ میں کی کہ 'انہدام ہو، شکست وریخت ہو، توڑ پھوڑ کی جائے، اور پھر ٹکڑے نئے سرے سے ترتیب دیئے جائیں''۔

اس وقت سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی میدان میں انہی خطوط پر این جی اوز کام کر رہی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ موجودہ نظریاتی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکا جائے، اداروں اور ملک کو توڑا جائے اور پھر نئے سرے سے ایک ملک وجود میں آئے جس کا نام 'اکھنڈ بھارت' ہو۔ اس توڑ پھوڑ اور ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے نقشے بنا کر بچوں کی کتابوں میں شامل کر دیے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مخصوص نظریات کی حامل این جی اوز نے ریاست کے اندر ایک اور ریاست قائم کر رکھی ہے۔ اربابِ اختیار مال کے مزے لوٹ رہے ہیں تو این جی اوز نوجوان نسل کی تعلیم وتربیت، اخلاق وتہذیب

کی بربادی پر اپنے آقاؤں سے داد وصول کر رہی ہیں۔

● **تعلیمی وسائل پر اثرات:** اس وقت وطنِ عزیز کو تعلیم کے نام پر باہر سے جو فنڈ ملتے ہیں، اس کا ایک بڑا حصّہ این جی اوز کے ہاتھوں میں جاتا ہے۔ پھر اس میں سے ایک بڑی رقم پلاننگ، پراجیکٹ ڈویلپمنٹ، قیمتی گاڑیوں، غیرممالک میں پروگراموں میں شرکت اور سیمینارز اور ورکشاپس کے نام پر خرچ ہوتی ہے۔ بہت سے پراجیکٹ جو تعلیم کے ہوں یا پانی و دیہی ترقی کے نام پر، سب پراجیکٹس سیاستدانوں، حکمرانوں، ان کی بہوبیٹیوں اور عزیزوں کو ملتے ہیں اور تعلیم کے لیے کچھ بچتا ہی نہیں۔

● **اداروں کی ویرانی:** این جی اوز کی جانب سے بڑے زور وشور سے سندھ اور دیگر صوبوں میں گھوسٹ سکولوں کی 'دریافت' کو بڑے کارنامے کے طور پر پیش کیا جارہا ہے، جنھیں سرداروں اور وڈیروں نے اپنی بیٹھک یا باڑہ بنا دیا ہے۔ یہ خبر سنا کر این جی اوز کے لیے مزید فنڈز کے حصول کا راستہ صاف کر دیا گیا ہے۔ مگر دوسری طرف پنجاب میں، اداروں کے انضمام کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے ۵ ہزار اسکولوں کو ضم کیا گیا، اور یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۵ ہزار زنانہ اور مردانہ اداروں کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کے بعد کوئی ڈھائی ہزار سکول بیک جنبشِ قلم ختم کر دیے گئے۔ یہ گھوسٹ عمارتیں/ اسکولز کس کام کے؟ شاید وڈیروں کے، یا پھر کچھ عرصہ بعد، یہ اسکولز این جی اوز کے قبضے میں ہوں گے، جو ان کی بیٹھک ہوں گے، یا پھر ملک کے خلاف مزید آسانی سے سازشیں کرنے کے مراکز ہوں گے، اور ان پر کسی این جی او کا بورڈ لگا ہوگا، اور کسی کو وہاں جانے یا پوچھنے کی جرأت نہ ہوگی۔ یوں اربوں کی پراپرٹی کوڑیوں کے مول ان کی گود میں جا گرے گی۔

● **مجموعی طور پر تعلیم پر اثرات:** اگر ہم مجموعی طور پر جائزہ لیں تو نظر آتا ہے کہ این جی اوز، تعلیمی نظام پر مختلف پہلوؤں سے منفی اثرات ہی ڈال رہی ہیں۔ نصابات میں قوم سے اس کا نظریہ، اخلاق، قومی وملّی اقدار وروایات چھین لی گئی ہیں، اور نوجوان نسل کو ان کی تاریخ سے دُور کر دیا گیا ہے۔ زبان، جو کسی قوم کی پہچان ہوتی ہے، قوم کو بے زبان بنا دیا ہے۔ تجزیاتی صلاحیت اور مافی الضمیر کے بیان کرنے کی صلاحیت سے بچہ عاری ہے، بھاری بھرکم انگریزی الفاظ کے مفہوم سے بیگانہ ہے۔ اداروں کے انضمام سے، اداروں میں تعلیم کے نام پر، بے راہروی کو عام، اخلاق باختگی کو

بے نیام اور فحاشی کو بے لگام کر دیا ہے، جب کہ غریب و متوسط طبقہ کے والدین کو کنگال کر دیا ہے۔

اصلاحِ احوال کے لیے تجاویز

۱- سب سے بنیادی اور پہلا کام تعلیم کا قبلہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیمی نظام کو اسلامی خطوط پر تشکیل دیا جائے۔ تعلیم کو صنعت کے بجائے پھر سے عبادت اور فرض کا درجہ دیا جائے اور اسے ریاست کی ذمہ داری قرار دیا جائے۔

۲- پوری دنیا کی طرح تعلیم کو مرکز کے ماتحت کرنے کے لیے آئینی ترمیم لائی جائے اور صوبوں میں دھکیلنے سے واپسی کا راستہ اپنایا جائے۔

۳- ایک آزاد اور خودمختار تعلیمی کمیشن بنایا جائے، جو پبلک سیکٹر کی جامعات، کالجوں، ہائی اور پرائمری اسکولوں کے ماہرینِ تعلیم، اساتذہ اور طلبہ نمائندوں پر مشتمل ہو، جو نہ صرف خرابیوں کا جائزہ لے سکے، بلکہ اصلاحات تجویز کرتے ہوئے ان کو عملاً نافذ بھی کر سکے۔

۴- پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کے لیے ایک ہی نصاب، قومی زبان ذریعۂ تدریس ہو، ایک ہی نظامِ امتحانات اور ایک ہی لباس ہو۔ دونوں سیکٹرز یعنی پبلک و پرائیویٹ کو ایک ہی قانون اور نظام کا پابند بنایا جائے، اور تعلیم میں تجارتی رجحان کا خاتمہ کیا جائے۔

۵- تعلیمی اداروں میں سیاسی و بیرونی مداخلت کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے اور اسے ممتاز خودمختار ماہرین تعلیم پر مشتمل کمیشن کے ماتحت کیا جائے۔

۶- تعلیمی نظام اور اداروں میں غیرملکی این جی اوز کی مداخلت پر پابندی لگائی جائے، اور اب تک تعلیم کے نام سے خرچ کیے جانے والے اربوں کے اخراجات کا آڈٹ کیا جائے۔ کرپشن میں ملوث اور تعلیم کی آڑ میں ملکی نظریات اور مفاد کے خلاف کام کرنے والی این جی اوز پر پابندی لگائی جائے اور ملوث ذمہ داراں کو قانون کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جائے۔

۷- ملک کے اندر تعلیمی نجکاری کی پالیسی کو ختم کی جائے۔

حوالہ جات

۱- ڈاکٹر معین الدین عقیل، مسلمان اور مغربی تعلیم، ص ۵۳-۵۴
۲- فتاویٰ عزیزیہ، بحوالہ سید محمد سلیم، ص ۲۶

۳- سیّد محمد سلیم، مسلمان اور مغربی تعلیم، ص ۲۰۶
۴- ایضاً، ص ۲۰۷
۵- عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص ۱۷۲
۶- ایضاً
۷- مسلمان اور مغربی تعلیم، ص ۱۳۸
۸- سیّد مصطفیٰ علی بریلوی، مسلمانانِ سندھ کی تعلیم، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۶۵-۶۸
۹- سیّد عابد علی وجدی، تاریخِ ریاستِ بھوپال، مقدمہ ص ۷
۱۰- ایضاً
۱۱- مسلمان اور مغربی تعلیم، ص ۷۰-۷۲
۱۲- ایضاً
۱۳- ناصر عباس نیر، تعلیمی زاویئے: نوآبادیاتی تعلیمی دور، ۲۴/اگست ۲۰۱۶ء
۱۴- تعلیمی پالیسی ۲۰۰۶ء، تعارف۔